ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1954

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اصولِ تفسیر (1954) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE — For Study & Reference

USMAN NOTES www.usmannotes.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، اس گائیڈ کو بطورِ رہنمائی استعمال کریں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: اصول اور تفسیر کے لغوی معنی؛ اصولِ تفسیر کا اصطلاحی معنی، موضوع، اہمیت اور فضیلت (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ اصول اور تفسیر کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے اصولِ تفسیر کا اصطلاحی معنی، موضوع، اہمیت اور فضیلت لکھیے۔ (20)

تعارف

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا آخری اور مکمل کلام ہے جو تمام انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ اس کلام کے صحیح فہم تک رسائی محض الفاظ کے ترجمے سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے کچھ قواعد وضوابط کی پاسداری ضروری ہے۔ انہی قواعد کے مجموعے کو اصولِ تفسیر کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہر فن کے اپنے اصول ہوتے ہیں جن کے بغیر اس فن میں درستی اور مہارت پیدا نہیں ہوتی، اسی طرح تفسیرِ قرآن کے بھی اصول ہیں جن کے بغیر علمی مفسر کو خطا اور باطل تاویل میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس جواب میں پہلے اصول اور تفسیر کے لغوی معنی بیان کیے جائیں گے، پھر اصولِ تفسیر کی اصطلاحی تعریف، اس کا موضوع، اس کی اہمیت اور اس کی فضیلت تفصیل سے پیش کی جائے گی تاکہ طالب علم پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ فن قرآن فہمی کی بنیاد کیوں قرار پایا ہے۔

اصول کا لغوی معنی

لفظ اصول، اصل کی جمع ہے۔ عربی لغت میں اصل سے مراد کسی چیز کی بنیاد، اس کی جڑ اور وہ بنیادی حصہ ہے جس پر دوسری چیز قائم ہو۔ اہلِ لغت نے اصل کے معنی اساس اور قاعدہ کے بیان کیے ہیں۔ درخت کی جڑ کو اصل اسی لیے کہا جاتا ہے کہ پورا درخت اسی پر کھڑا ہوتا ہے اور اسی سے زندگی پاتا ہے، اور عمارت کی بنیاد کو بھی اصل اسی لیے کہتے ہیں کہ اوپر کی ساری تعمیر اسی پر مبنی ہوتی ہے؛ بنیاد کمزور ہو تو عمارت بھی کمزور ہوتی ہے۔ اصطلاحی طور پر اصل اس قاعدے یا ضابطے کو کہتے ہیں جس سے جزئی مسائل اخذ کیے جائیں اور جس کی طرف فروعی احکام و مسائل لوٹائے جائیں۔ اسی مناسبت سے فقہ کے قواعد کو اصولِ فقہ اور تفسیر کے قواعد کو اصولِ تفسیر کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ قواعد مفسر کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور انہی کی روشنی میں وہ قرآنی آیات کے مفاہیم اور مرادِ الٰہی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو شخص بنیاد کے بغیر عمارت کھڑی کرنا چاہے گا اس کی کوشش لازماً ناکام اور خطرناک ہو گی۔

تفسیر کا لغوی معنی

تفسیر کا مادہ ف، س، ر ہے۔ فسر کے معنی کھولنا، بیان کرنا، واضح کرنا اور کسی پوشیدہ چیز سے پردہ اٹھانا ہیں۔ کہا جاتا ہے فسرت الشیء یعنی میں نے اسے واضح اور روشن کر دیا۔ بعض اہلِ لغت کے نزدیک تفسیر کا تعلق سفور سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں، جیسے عورت کے چہرے سے نقاب کے اٹھنے کو سفور کہا جاتا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ تفسیر اس علم کا نام ہے جس سے قرآن کے وہ معانی معلوم ہوں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے۔ اصطلاح میں تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآنِ مجید کے الفاظ کے مفاہیم، ان کی ترکیب، آیات کے مقاصد اور احکام کو انسانی استطاعت کے مطابق بیان کیا جاتا ہے۔ امام زرکشی نے البرہان فی علوم القرآن میں اور علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں تفسیر کی جامع تعریفیں نقل کی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ تفسیر قرآن کے مفاہیم کی توضیح، اس کی مراد کی تبیین اور اس کے احکام کے استنباط کا نام ہے۔

اصولِ تفسیر کا اصطلاحی معنی

اصولِ تفسیر ان قواعد و ضوابط اور علوم و مباحث کے مجموعے کا نام ہے جن کی مدد سے قرآنِ مجید کی صحیح تفسیر تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور مفسر غلطی اور گمراہ کن تاویلات سے محفوظ رہتا ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے مشہور رسالے مقدمہ فی اصول التفسیر میں ان بنیادوں کو واضح کیا جن پر صحیح تفسیر قائم ہوتی ہے۔ ان اصولوں میں سرِ فہرست یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآن سے کی جائے، پھر سنتِ نبوی سے، پھر اقوالِ صحابہ سے، پھر اقوالِ تابعین سے اور پھر لغتِ عرب سے استفادہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ اسبابِ نزول، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، مطلق و مقید، ناسخ کی پہچان، قراءات اور نظمِ قرآن جیسے مباحث بھی اصولِ تفسیر ہی کے اہم ابواب ہیں۔ گویا اصولِ تفسیر مفسر کے لیے وہ میزان اور کسوٹی ہے جس پر رکھ کر وہ اپنی ہر رائے اور ہر تاویل کو پرکھتا ہے کہ وہ میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

اصولِ تفسیر کی حیثیت محض نظری اور کتابی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ جو شخص ان اصولوں کے بغیر تفسیر کا دعویٰ کرے وہ تفسیر بالرائے کے زمرے میں آتا ہے، جس کی سخت ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لیا۔ اسی

لیے مفسر پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ تفسیر سے پہلے ان اصولوں کو اچھی طرح سیکھے، کیونکہ ان کے بغیر قدم بڑھانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص علمِ طب کے اصول جانے بغیر مریض کا علاج شروع کر دے۔ اصولِ تفسیر درحقیقت وہ حفاظتی حصار ہے جو قرآن کے مفاہیم کو تحریف، من مانی تاویل اور ذاتی خواہشات کی آمیزش سے بچاتا ہے، اور یہی اس فن کی اصل پہچان ہے۔

اصولِ تفسیر کا موضوع

ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس کے احوال و عوارض سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے۔ اصولِ تفسیر کا موضوع قرآنِ مجید کی آیات ہیں، اس حیثیت سے کہ ان کے معانی و مفاہیم تک صحیح طریقے سے کیسے پہنچا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس علم کا موضوع وہ ماخذ و دلائل ہیں جن سے تفسیر اخذ کی جاتی ہے، یعنی قرآن، سنت، آثارِ صحابہ و تابعین اور لغتِ عرب، اور ان سے متعلق تمام مباحث۔ اس علم میں بحث اس امر سے ہوتی ہے کہ کس آیت کا مفہوم کس ماخذ سے ثابت ہو گا، ظاہری تعارض کی صورت میں ترجیح کیسے دی جائے گی، ناسخ و منسوخ کی پہچان کیسے ہو گی، متشابہ آیات سے کیسے نمٹا جائے گا اور کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کا فیصلہ کن بنیادوں پر ہو گا۔ بعض علماء نے اس کا موضوع کلام اللہ کو قرار دیا ہے، اس پہلو سے کہ اس کی مراد معلوم کرنا مقصود ہے۔ بہر حال اس علم کے موضوع کا مرکز و محور قرآنِ مجید ہی ہے اور اسی کے گرد اس کی تمام ابحاث گھومتی ہیں۔

اصولِ تفسیر کی اہمیت

اصولِ تفسیر کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید ہدایت اور قانون کی کتاب ہے اور اس کے احکام و ہدایات پر عمل کا سارا دارومدار اس کے صحیح فہم پر ہے۔ اگر فہم غلط ہو جائے تو عقیدہ بھی بگڑتا ہے اور عمل بھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ باطل فرقوں کی گمراہی کی بنیاد اکثر قرآن کی من مانی تفسیر ہی رہی ہے؛ خوارج نے آیاتِ وعید کو مسلمانوں پر چسپاں کیا، بعض گروہوں نے متشابہات کے پیچھے چل کر محکمات کو چھوڑ دیا، اور دورِ جدید میں منکرینِ حدیث نے سنت کو نظر انداز کر کے قرآن کو اپنے نظریات کے تابع بنانے کی کوشش کی۔ اصولِ تفسیر مفسر کو اسی بے راہ روی سے بچاتے ہیں۔ اس علم کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ اختلافِ تفسیر کی وجوہات کو واضح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ صحابہ و تابعین

کے درمیان اکثر اختلاف تضاد و تناقض کا نہیں بلکہ تنوع و تکمیل کا تھا۔ تیسری اہمیت یہ ہے کہ ان اصولوں کی بدولت ہر طالب علم کسی بھی تفسیر کو پرکھ سکتا ہے کہ وہ مستند ماخذ پر مبنی ہے یا محض ذاتی رائے کا اظہار ہے۔ اس اعتبار سے اصولِ تفسیر پورے علمِ تفسیر کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔

اصولِ تفسیر کی فضیلت

قرآن و سنت میں علمِ قرآن کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ مفسر کا درجہ اس لیے بلند ہے کہ وہ اللہ کے کلام کی مراد لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ہدایت کے اس سرچشمے سے امت کو سیراب کرتا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل کا علم سکھا، جس سے معلوم ہوا کہ علمِ تفسیر و تاویل اللہ تعالیٰ کی خاص عطا اور بڑی نعمت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ علوم کی شرافت ان کے موضوع کی شرافت سے ہوتی ہے، اور چونکہ تفسیر کا موضوع کلامِ الٰہی ہے جو سب کلاموں سے اشرف ہے، اس لیے علمِ تفسیر سب علوم میں اشرف قرار پایا۔ اصولِ تفسیر اس اشرف علم کی کنجی اور اس کا دروازہ ہے، لہٰذا اس کے سیکھنے والے کو بھی اس فضیلت میں شامل کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ کلامِ اللہ کی خدمت کا صحیح اہل بنتا ہے اور اس خدمت کو اس کے پورے آداب کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اصول جمع ہے اصل کی، جس کے لغوی معنی بنیاد، جڑ اور قاعدے کے ہیں؛ تفسیر کے معنی کھولنا، بیان کرنا اور پردہ اٹھانا ہیں؛ اور اصولِ تفسیر ان قواعد و ضوابط کا نام ہے جن کی روشنی میں قرآنِ مجید کی صحیح مراد تک پہنچا جاتا ہے۔ اس علم کا موضوع قرآنِ مجید اور اس کے ماخذِ تفسیر ہیں، اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مفسر کو خطا، تحریف اور باطل تاویل سے بچاتا ہے، اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ یہ اشرف العلوم یعنی علمِ تفسیر کا دروازہ ہے۔ ہر طالب علم قرآن کے لیے ان اصولوں کا سیکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی معالج کے لیے علمِ طب کے اصول سیکھنا، کیونکہ بغیر اصول کے تفسیر محض ذاتی رائے رہ جاتی ہے، اور قرآن کے معاملے میں ذاتی رائے سخت خطرناک اور گناہ کا باعث ہے۔

سوال نمبر2: سرسید احمد خان اور مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کے تحریر کردہ اصولِ تفسیر کے مندرجات کا جائزہ(20نمبر)

سوال نمبر2۔ سرسید احمد خان اور مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کے تحریر کردہ اصول تفسیر کے مندرجات کا جائزہ پیش کیجیے۔(20)

تعارف

برصغیر پاک وہند میں اصولِ تفسیر پر باقاعدہ تصنیف کی روایت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر سے نقطۂ کمال کو پہنچتی ہے، مگر اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی افکار، جدید سائنسی انکشافات اور مستشرقین کے اعتراضات نے مسلمانوں کے ذہنوں میں نئے سوالات پیدا کیے تو بعض اہلِ علم نے تفسیر کے اصولوں کو ازسرِنو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سرسید احمد خان نمایاں ہیں جنہوں نے تفسیر القرآن تحریر کی اور اس کے اصول الگ رسالے میں بیان کیے، جبکہ مولانا عبدالمالک کانڈھلوی نے اپنی تصنیف تفسیر قرآن کے اصول و قواعد میں کلاسیکی اصولوں کو جدید مباحث کے ساتھ منظم انداز میں پیش کیا۔ اس جواب میں دونوں حضرات کے تحریر کردہ اصولِ تفسیر کے مندرجات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرسید احمد خان: پس منظر اور تصنیف

سرسید احمد خان (1817ء تا 1898ء) نے محسوس کیا کہ مسلمان جدید تعلیم اور سائنس سے بیگانگی کی وجہ سے پسماندگی کا شکار ہیں اور انگریز و مستشرقین قرآن و اسلام پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی ایسی تفسیر پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا جو ان کے خیال میں عقل اور قوانینِ فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ ان کی تفسیر تفسیر القرآن وھو الھدیٰ والفرقان کئی جلدوں میں شائع ہوئی مگر نامکمل رہی اور سورۃ النحل تک ہی پہنچ سکی۔ اس تفسیر کے اصول انہوں نے اپنے رسالے تحریر فی اصول التفسیر میں بیان کیے، جس میں انہوں نے پندرہ اصول مرتب کیے جن کی بنیاد پر انہوں نے اپنی تفسیر لکھی۔ یہ رسالہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے برصغیر کی تفسیری تاریخ میں ایک ممتاز مگر متنازع حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس نے بعد میں ایک طویل علمی بحث کو جنم دیا جس میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا۔

سرسید کے اصولِ تفسیر کے مندرجات

سرسید کے اصولوں کا مرکزی اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اللہ کا کلام اللہ کے کام سے متصادم نہیں ہو سکتا۔ ان کی اصطلاح میں قرآن کلام اللہ یعنی ورڈ آف گاڈ ہے اور کائنات کام اللہ یعنی ورک آف گاڈ ہے، اور دونوں کا منبع ایک ہی ذات ہے، لہٰذا ان میں تضاد ناممکن ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قوانینِ فطرت اٹل اور ناقابلِ تبدیل ہیں، پس جو آیت بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہو اس کی ایسی تاویل کی جائے گی جو فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ اسی اصول کے تحت انہوں نے معجزات اور فوق الفطرت واقعات کی ظاہری صورت کے بجائے تاویلی مفاہیم اختیار کیے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کا اولین ماخذ خود قرآن ہے اور ایک آیت کی تشریح دوسری آیت سے کی جائے۔ تیسرا اصول یہ کہ احادیث کو اسی حد تک حجت مانا جائے جہاں تک ان کی سند و متن قرآنی اصولوں پر پورے اتریں؛ ان کے نزدیک خبرِ واحد سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ اسبابِ نزول کی روایات کو تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے، کیونکہ ان میں بہت سی ضعیف اور غیر مستند روایات داخل ہو گئی ہیں۔

ان کے بقیہ اصولوں میں یہ امور شامل ہیں کہ الفاظِ قرآن کو انہی معنوں میں لیا جائے جو نزول کے زمانے کے اہلِ عرب میں مستعمل تھے اور بعد کی اصطلاحات کو ان پر نہ چسپاں کیا جائے؛ کہ ناسخ و منسوخ کا دائرہ بہت محدود ہے اور اکثر مقامات پر نسخ کے بجائے تخصیص اور تاویل سے کام لیا جائے؛ کہ قصصِ قرآنی کا مقصد تاریخی تفصیلات نہیں بلکہ عبرت و نصیحت ہے، لہٰذا ان میں تمثیلی پہلو نمایاں ہے؛ اور یہ کہ قرآن کا اصل مقصد ہدایت و اخلاق ہے، سائنسی مسائل کا بیان اس کا موضوع نہیں۔ ان اصولوں کے پیچھے ان کا یہ بنیادی عقیدہ کارفرما تھا کہ اسلام دینِ فطرت ہے، لہٰذا اس کی کتاب بھی فطرت کے مسلمہ قوانین سے ٹکرا نہیں سکتی۔ یہی وہ نکات ہیں جن سے ان کی تفسیر کا مزاج متعین ہوا اور جن پر سب سے زیادہ بحث بھی ہوئی۔

سرسید کے ان اصولوں پر علمائے امت نے سخت تنقید کی۔ مولانا عبدالحق حقانی نے تفسیر حقانی کے مقدمے میں ان کے اصولوں کا تفصیلی رد کیا اور کہا کہ قانونِ فطرت کو وحی پر حاکم بنا دینا تفسیر نہیں بلکہ تاویلِ باطل ہے، کیونکہ معجزہ خود خالقِ فطرت کا فعل ہے اور جو ذات قوانین بناتی ہے وہ انہیں معطل بھی کر سکتی ہے۔ ناقدین کی رائے میں سرسید نے

انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے مانوس کرنے کی کوشش میں نصوص کی ظاہری دلالت کو قربان کر دیا۔ تاہم جائزے کی امانت داری کا تقاضا ہے کہ یہ بھی کہا جائے کہ ان کا مقصد قرآن کا دفاع اور مسلمانوں کی ذہنی رہنمائی تھا، اور ان کی اس کوشش نے برصغیر میں قرآن فہمی کی ایک نئی بحث کو ضرور جنم دیا جس سے علمی حلقے متحرک ہوئے۔

مولانا عبدالمالک کانڈھلوی: تعارف اور تصنیف

مولانا عبدالمالک کانڈھلوی ان اہلِ علم میں سے ہیں جنہوں نے اصولِ تفسیر کو اردو زبان میں باقاعدہ اور منظم کتابی شکل دی۔ ان کی تصنیف تفسیر قرآن کے اصول و قواعد اس موضوع کی قابلِ ذکر کتابوں میں شمار ہوتی ہے، جس میں انہوں نے کلاسیکی اصولوں کو عصرِ حاضر کے سوالات کے پس منظر میں مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب تحقیقی، معتدل اور ماخذ سے پوری طرح بندھا ہوا ہے؛ وہ سلف کے طریقے کو بنیاد بناتے ہیں اور جدید تفسیری رجحانات کو اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ان کی کتاب محض اصولوں کی فہرست نہیں بلکہ ایک مکمل نصابی رہنما ہے جس سے طالب علم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے کن مراحل سے گزر کر تفسیر مرتب کی اور آج کے طالب علم کو تفسیر پڑھتے وقت کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کے اصولِ تفسیر کے مندرجات

مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کی کتاب کے نمایاں مندرجات درج ذیل ہیں۔ اول، وحی کی حقیقت، نزولِ قرآن کی کیفیت اور جمع و حفاظتِ قرآن کی تاریخ، جس سے قرآن کی محفوظیت اور اس کے متن کی قطعیت ثابت ہوتی ہے۔ دوم، تفسیر و تاویل کا مفہوم اور ان کا باہمی فرق، اور تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کی اقسام؛ ان کے نزدیک پسندیدہ رائے وہ ہے جو اصولوں کی پابند اور ماخذ سے مستند ہو اور مردود رائے وہ ہے جو ذاتی خیال پر مبنی ہو۔ سوم، ماخذِ تفسیر کی باقاعدہ ترتیب، یعنی قرآن سے قرآن کی تفسیر، سنتِ نبوی، اقوالِ صحابہ و تابعین، اسبابِ نزول، لغت و ادبِ عرب اور ان سب کے بعد اصولوں کے دائرے میں اجتہاد۔ چہارم، علومِ قرآن کے بڑے مباحث یعنی محکم و متشابہ، عام و خاص، مطلق و مقید، ناسخ و منسوخ، قراءات اور غریب القرآن کی وضاحت۔ یہ مندرجات بتاتے ہیں کہ ان کی کتاب خالص کلاسیکی روایت کی وارث ہے اور اسی روایت کو انہوں نے عصرِ حاضر کی زبان میں منتقل کیا ہے۔

ان کی کتاب کا ایک خاص اور نمایاں باب سائنس اور تفسیرِ قرآن کا ہے، جس میں انہوں نے سائنسی تفسیر کے رجحان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے، سائنس کی درسی کتاب نہیں، اور کسی جدید سائنسی نظریے کو قرآن کا عین مدلول قرار دینا درست نہیں، کیونکہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں اور اگر آج ایک نظریے کو قرآن سے جوڑا جائے اور کل وہ نظریہ غلط ثابت ہو تو خود قرآن پر حرف آئے گا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن نہ ہوائی جہاز اور راکٹوں کی صنعت سکھانے کے لیے نازل ہوا ہے اور نہ یہ تعلیم مقصدِ رسالت ہے، بلکہ وحی اور رسالت کا مقصد تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب میں اسرائیلیات کے بارے میں متوازن اصول بھی بیان ہوا ہے کہ اسرائیلی روایات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھا جائے: جو موافق ہو اسے روایت کی حد میں قبول کیا جائے، جو مخالف ہو وہ رد ہے اور جس کی تصدیق و تکذیب نہ ہو سکے اسے نہ بیان کیا جائے۔ کتاب میں مفسر کی شرائط اور جدید مفسرین کے مناہج کا جائزہ بھی شامل ہے۔

تقابلی جائزہ

دونوں حضرات کے مندرجات کا تقابل کیا جائے تو بنیادی فرق نقطۂ آغاز کا ہے۔ سرسید کا نقطۂ آغاز عصر کے چیلنج اور عقل و فطرت کے تقاضے ہیں؛ انہوں نے اصول اس لیے بنائے کہ قرآن کو جدید ذہن کے لیے قابلِ قبول بنایا جا سکے، اس لیے ان کے اصولوں میں روایت کی حیثیت ثانوی اور تاویل کا دائرہ وسیع ہے۔ مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کا نقطۂ آغاز روایت اور ماخذ ہے؛ انہوں نے اصول اس لیے مرتب کیے کہ طالب علم سلف کے مستند طریقے سے جڑا رہے اور جدید رجحانات کو انہی اصولوں کی روشنی میں پرکھ سکے، اس لیے ان کے ہاں روایت اولین حجت اور تاویل اصولوں کی پابند ہے۔ دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں نے اصولِ تفسیر کو کتابی شکل دی، دونوں اسبابِ نزول اور روایات کی جانچ پر زور دیتے ہیں، مگر سرسید تنقید میں تاریخی شک تک جاتے ہیں جبکہ کانڈھلوی اصولِ حدیث کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی فرق دونوں کے مندرجات کے مزاج کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سر سید احمد خان کے تحریر کردہ اصولِ تفسیر، جن کی تفصیل تحریر فی اصول التفسیر میں پندرہ اصولوں کی صورت میں موجود ہے، کلامِ الٰہی اور قوانینِ فطرت کی ہم آہنگی کو بنیاد بناتے ہیں اور ان میں تاویل کو وسیع بنیاد ملی ہے، جبکہ مولانا عبدالمالک کانڈھلوی کی تفسیر قرآن کے اصول و قواعد کلاسیکی ماخذ، تفسیر بالماثور کی ترتیب، علومِ قرآن کے مباحث اور سائنسی تفسیر پر متوازن تنقید پر مشتمل ہے۔ طالب علم کے لیے دونوں کا مطالعہ برصغیر کے تفسیری ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے: ایک سے جدید رجحانات کی جڑیں معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے سے مستند اصولوں کی پوری ساخت سامنے آتی ہے۔

سوال نمبر 3: علم التذکیر بالموت ومابعد الموت اور علم التذکیر بایام اللہ کے متعلقات (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ علم التذکیر بالموت ومابعد الموت اور علم التذکیر بایام اللہ کے متعلقات کو تفصیل سے لکھیے۔ (20)

تعارف: علومِ خمسہ کا پس منظر

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید کے تمام مضامین پانچ علوم کے گرد گھومتے ہیں: علم الاحکام، علم المخاصمہ یعنی جدل، علم التذکیر بآلاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت ومابعد الموت۔ گویا پورا قرآن انہی پانچ بڑے موضوعات کا مجموعہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول اصلاً انہی علوم کے بیان کے لیے ہوا۔ ان پانچ میں سے آخری تین علوم تذکیر یعنی یاد دہانی اور نصیحت کے علوم ہیں؛ آلاء اللہ سے نعمتوں کی یاد دہانی ہوتی ہے، ایام اللہ سے تاریخی واقعات کے ذریعے عبرت حاصل ہوتی ہے اور موت ومابعد الموت سے انسان کو اس کے انجام کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس جواب میں انہی دو علوم، یعنی علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت ومابعد الموت، کے متعلقات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

علم التذکیر بایام اللہ: مفہوم

ایام اللہ سے مراد وہ خاص ایام اور واقعات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی نصرت اور اس کی گرفت نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ عربی محاورے میں ایام کا لفظ بڑے واقعات، لڑائیوں اور تاریخی موڑ کے دنوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے عرب اپنی مشہور جنگوں کو ایام العرب کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم کو ایام اللہ کی یاد دلائیں، یعنی اللہ کے ان ایام کی جن میں اس نے بنی اسرائیل پر انعام کیا اور ان کے دشمنوں کو تباہ کیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے الفاظ میں ایام اللہ وہ واقعات و حوادث ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداروں پر انعام اور مجرموں پر عذاب کے طور پر ظاہر فرمائے، جیسے انبیاء علیہم السلام کے قصص اور ان کی امتوں کے ان کے ساتھ معاملات۔ پس اس علم کا دائرہ وہ تمام تاریخی واقعات ہیں جن میں سنتِ الٰہی، یعنی اقوام کے بارے میں اللہ کا اٹل قانون، نمایاں ہوتا ہے۔

ایام اللہ کے متعلقات

علم التذکیر بایام اللہ کے متعلقات کو چند بڑے عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا متعلقہ قصص الانبیاء ہیں، جن میں حضرت نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان اور عیسیٰ علیہم السلام سمیت بہت سے انبیاء کے واقعات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مراحل آتے ہیں؛ ان قصص میں دعوت، مخالفت، صبر، استقامت اور بالآخر حق کی فتح و باطل کی شکست کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دوسرا متعلقہ اقوامِ سابقہ کا عروج و زوال ہے، جیسے عاد و ثمود کی تباہی، قومِ لوط کی بستیوں کا الٹ دیا جانا، اصحاب الایکہ اور اہلِ سبا کا انجام، اور فرعون و ہامان کا غرق ہونا؛ ان واقعات میں ان قوموں کے جرائم بھی بیان ہوتے ہیں اور ان کی ہلاکت کے اسباب بھی۔ تیسرا متعلقہ بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات اور پھر ان کی ناشکری پر تنبیہات ہیں، مثلاً دریا کا پھٹنا اور فرعون سے نجات، من و سلویٰ کا نزول، بادل کا سایہ اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا۔

چوتھا متعلقہ سیرتِ نبوی اور غزوات کے وہ واقعات ہیں جن میں اللہ کی نصرت کے اصول واضح ہوتے ہیں، جیسے غزوۂ بدر میں قلت کے باوجود فتح، غزوۂ احد میں آزمائش، غزوۂ خندق میں دشمن کا ناکام لوٹنا، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ۔ پانچواں متعلقہ سننِ الٰہیہ ہیں، یعنی تاریخ کے وہ اٹل قوانین جن کا قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ عدل، تقویٰ اور اطاعت پر قومیں اٹھتی ہیں، ظلم، سرکشی اور ناشکری پر تباہ ہوتی ہیں، اور یہ کہ اللہ کی سنت میں نہ تبدیلی ہوتی ہے نہ تحویل۔ چھٹا متعلقہ یہ ہے کہ ان واقعات کو آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ

وعبرت بنایا گیا ہے؛ قرآن خود فرماتا ہے کہ انبیاء کے قصوں میں اہلِ عقل کے لیے عبرت ہے، یہ قصے جھوٹے افسانے نہیں بلکہ پچھلی کتابوں کی تصدیق اور ہدایت و رحمت ہیں۔

قرآنِ مجید کا ایک بہت بڑا حصہ انہی متعلقات پر مشتمل ہے، خصوصاً مکی سورتوں میں یہ مضمون بہت نمایاں ہے۔

علم التذکیر بالموت ومابعد الموت: مفہوم

علم التذکیر بالموت ومابعد الموت سے مراد موت اور موت کے بعد پیش آنے والے تمام احوال کی یاد دہانی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس علم کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ اس کے تحت حشر و نشر، حساب و کتاب، میزان، جنت اور جہنم جیسے مضامین آتے ہیں۔ انسان فطرتاً دنیوی زندگی کی رنگینیوں میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا انجام یاد نہیں رہتا، اور یہی غفلت اسے گناہ پر جری کرتی ہے۔ قرآنِ مجید بار بار موت اور آخرت کی یاد دلا کر اس غفلت کو توڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے اور تمہیں تمہارے پورے اجور قیامت کے دن ہی دیے جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لذتوں کو ختم کرنے والی موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ پس یہ علم قرآن کے وعظ و نصیحت کا مرکزی حصہ ہے اور ایمان کے بنیادی عقیدے، یعنی آخرت پر ایمان، کی پوری تفصیل اسی علم میں بیان ہوتی ہے۔

موت ومابعد الموت کے متعلقات

اس علم کے متعلقات کو ترتیب واریوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلا متعلقہ موت و سکرات الموت ہے، یعنی موت کی حقیقت، روح کا قبض ہونا، مومن کے لیے فرشتوں کا خوش آمدید استقبال اور نافرمان کے لیے سختی؛ قرآن واضح کرتا ہے کہ موت فنا کا نام نہیں بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال ہے۔ دوسرا متعلقہ عالمِ برزخ اور قبر ہے، جس میں قبر کی نعمت یا عذاب اور سوال و جواب کے مضامین آتے ہیں۔ تیسرا متعلقہ نفخِ صور اور بعث ہے، کہ صور پھونکا جائے گا، مردے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور سب میدانِ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔ چوتھا متعلقہ حشر و نشر کی کیفیت ہے، جس میں لوگوں کا جمع ہونا، سورج کا قریب آنا، پسینے میں ڈوبنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ کا عظیم واقعہ شامل ہے۔ پانچواں متعلقہ عرض و حساب و کتاب ہے، کہ نامۂ اعمال دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور ذرہ برابر نیکی اور بدی بھی سامنے آ جائے گی۔

چھٹا متعلقہ میزان ہے، کہ اعمال تولے جائیں گے؛ جس کے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوا وہ کامیاب اور جس کا ہلکا ہوا وہ ناکام ہو گا۔ ساتواں متعلقہ صراط ہے، کہ سب کو پل صراط سے گزرنا ہو گا اور اہلِ ایمان اپنے اعمال کے بقدر رفتار سے گزریں گے۔ آٹھواں متعلقہ شفاعت ہے، کہ انبیاء، ملائکہ اور صالحین اللہ کے اذن سے شفاعت کریں گے۔ نواں متعلقہ جنت اور اس کی نعمتیں ہیں، نہریں، محلات، حور و غلمان سب سے بڑی نعمت یعنی دیدارِ الٰہی اور رضائے الٰہی۔ دسواں متعلقہ جہنم اور اس کے عذاب ہیں، اس کے طبقات، اس کی آگ کی شدت اور اہلِ جہنم کی حسرت و پچھتاوا۔ گیارھواں متعلقہ خالدین ابدی زندگی ہے کہ آخرت کا انجام ہمیشہ کے لیے ہو گا، یا تو ہمیشہ کی نعمت یا ہمیشہ کا عذاب۔ قرآنِ مجید کی متعدد سورتیں، خاص طور پر الواقعہ، الحاقہ، القیامہ، التکویر، الانفطار اور الزلزال انہی متعلقات کی تفصیل سے بھری ہوئی ہیں۔

دونوں علوم کے مقاصد و اثرات

ان دونوں علوم کا مقصد محض تاریخی یا غیبی معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ تذکیر ہے، یعنی دلوں کی بیداری۔ ایام اللہ کے بیان سے انسان تاریخ کا شعور حاصل کرتا ہے کہ اقوام کے عروج و زوال کے اصل اسباب کیا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی قوم و ملت کی زندگی کو انہی اصولوں پر جانچ سکتا ہے۔ موت اور آخرت کی یاد سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، دنیوی حرص و ہوس کم ہوتی ہے، مال و دولت کی محبت میں اعتدال آتا ہے اور آخرت کی تیاری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان تذکیری علوم کی تفصیل، یعنی ان سے متعلق احادیث و آثار کا تفصیلی بیان، واعظ اور مذکر کی طرف لوٹتا ہے، کیونکہ یہ علوم براہِ راست وعظ و نصیحت سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کے باطن کی اصلاح کا ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطباء اور مبلغین کی تقریروں کا بڑا حصہ انہی دو موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علم التذکیر بایام اللہ کے متعلقات میں قصص الانبیاء، اقوامِ سابقہ کا عروج و زوال، بنی اسرائیل پر انعامات، سیرت و غزوات کے واقعات، سننِ الٰہیہ اور عبرت و نصیحت کے تمام تاریخی مضامین شامل ہیں؛ جبکہ علم التذکیر بالموت و مابعد الموت کے متعلقات میں موت و سکرات، عالمِ برزخ، نفخِ صور و بعث، حشر و حساب، میزان، صراط،

شفاعت، جنت و جہنم اور خلود کے مضامین آتے ہیں۔ یہ دونوں علوم قرآنِ مجید کے تذکیری اسلوب کی روح ہیں: ایک ماضی کی طرف لے جا کر عبرت دلاتا ہے اور دوسرا مستقبل یعنی آخرت کی طرف لے جا کر تیاری کا شعور عطا کرتا ہے، اور دونوں کا حاصل انسان کی اصلاح و ہدایت ہے۔

سوال نمبر 4: شاہ ولی اللہ کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد اور ناسخ و منسوخ آیات کی فہرست (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد تحریر کرتے ہوئے ان ناسخ و منسوخ آیات کی فہرست ضبطِ تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

ناسخ و منسوخ کا علم اصولِ تفسیر کے اہم ترین ابواب میں سے ہے، کیونکہ اس کے جانے بغیر آیاتِ احکام کی صحیح تعبیر ممکن نہیں رہتی۔ نسخ کے لغوی معنی مٹانا، زائل کرنا اور نقل کرنا ہیں، اور اصطلاح میں نسخ سے مراد کسی شرعی حکم کو بعد میں آنے والے شرعی حکم کے ذریعے اٹھا لینا ہے۔ قرآنِ مجید میں نسخ کے واقع ہونے پر علماء کا اصولی اتفاق ہے، البتہ منسوخ آیات کی تعداد میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض متقدمین نے یہ تعداد پانچ سو تک بیان کی، جبکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے دقیق تحقیق کے بعد اسے گھٹا کر صرف پانچ آیات تک محدود کر دیا۔ اس جواب میں پہلے اس اختلاف کی وجہ بیان کی جائے گی، پھر شاہ صاحب کا موقف اور آخر میں ان پانچ ناسخ و منسوخ آیات کی فہرست پیش کی جائے گی۔

نسخ کا مفہوم اور تعداد میں اختلاف کی وجہ

تعداد کے اس بڑے اختلاف کی اصل وجہ نسخ کی اصطلاح کا تفاوت ہے۔ متقدمین علماء کے نزدیک نسخ کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا؛ وہ تخصیص، تقیید، استثناء اور حتیٰ کہ ایک عام حکم کی وضاحت کو بھی نسخ کہہ دیتے تھے۔ اس وسیع مفہوم کے سبب جہاں کہیں دو آیتوں میں بظاہر فرق نظر آیا، وہاں نسخ کا قول کر لیا گیا اور یوں منسوخ آیات کی تعداد بڑھتے بڑھتے سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ ابن الجوزی نے اپنی کتاب میں ڈھائی سو کے قریب آیات کو منسوخ شمار کیا۔ بعد کے محققین نے نسخ کی تعریف کو محدود کیا کہ نسخ صرف وہاں

ہو گا جہاں دونوں حکموں میں حقیقی تعارض ہو اور جمع و تطبیق کی کوئی صورت ممکن نہ ہو۔ اس محدود تعریف کے نتیجے میں تعداد کم ہونے لگی؛ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں اسے تقریباً اکیس آیات تک محدود کیا اور ان میں بھی بحث کی گنجائش رکھی۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں شاہ ولی اللہ نے اس بحث کو آگے بڑھایا۔

شاہ ولی اللہ کا موقف: منسوخ آیات صرف پانچ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں اس مسئلے پر نہایت عمدہ اور متوازن بحث کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ متاخرین نے نسخ کا لفظ جس محدود معنی میں استعمال کیا ہے اس کے اعتبار سے منسوخ آیات کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے، اور جس توجیہ کو ہم نے اختیار کیا ہے اس کے اعتبار سے یہ تعداد چند آیات سے آگے نہیں بڑھتی۔ انہوں نے علامہ سیوطی کی ذکر کردہ منسوخ آیات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا اور ان میں سے اکثر آیات کی ایسی معقول توجیہ اور تطبیق پیش کر دی کہ انہیں منسوخ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی؛ مثلاً بعض آیات میں حکم دراصل تخصیص کے قبیل سے تھا، بعض میں آیت اپنے محل پر باقی تھی اور اس کا تعلق خاص حالات سے تھا، اور بعض میں دو حکم الگ الگ صورتوں سے متعلق تھے۔ ان پندرہ کی توجیہ کے بعد صرف پانچ آیات ایسی رہ گئیں جن میں حقیقی نسخ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں، یعنی ان میں حکم کا اٹھایا جانا قطعی طور پر ثابت ہے اور کوئی تطبیق ممکن نہیں۔ پس شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک قرآنِ مجید میں حقیقی معنوں میں منسوخ آیات کی تعداد صرف پانچ ہے۔ اس موقف کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس سے قرآن کے زیادہ سے زیادہ حصے کے محکم اور قابلِ عمل ہونے کی حفاظت ہوتی ہے اور نسخ کا دروازہ بے جا وسعت سے بند ہو جاتا ہے۔

پانچ منسوخ آیات کی تفصیل

پہلی منسوخ آیت سورۃ البقرہ کی آیت 180 ہے، جس میں حکم تھا کہ جس شخص کو موت آئے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا اس پر فرض ہے۔ یہ حکم میراث کی آیات کے نزول سے پہلے تھا؛ جب سورۃ النساء میں ہر وارث کا متعین حصہ مقرر کر دیا گیا تو وصیت کی فرضیت ختم ہو گئی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔ دوسری منسوخ آیت سورۃ البقرہ کی آیت 184 ہے، جس کے ابتدائی مفہوم کے مطابق روزے کی طاقت رکھنے

والے کو اختیار تھا کہ روزہ رکھے یا فدیے میں مسکین کو کھانا کھلائے۔ بعد میں آیت 185 نازل ہوئی کہ جو شخص رمضان کا مہینہ پائے وہ لازماً روزے رکھے، اور اس سے طاقت رکھنے والوں کے لیے فدیے کا اختیار منسوخ ہو گیا؛ اب فدیہ صرف اس کے لیے ہے جو روزے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔

تیسری منسوخ آیت سورۃ البقرہ کی آیت 240 ہے، جس میں حکم تھا کہ جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، ان کی بیواؤں کے لیے ایک سال تک کے نان نفقے اور رہائش کی وصیت کی جائے، یعنی عدت ایک سال تھی۔ یہ حکم آیت 234 سے منسوخ ہوا، جس میں عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی۔ چوتھی منسوخ آیت سورۃ النساء کی آیت 15 ہے، جس میں بدکاری کی مرتکب عورتوں کے بارے میں حکم تھا کہ انہیں گھروں میں قید رکھا جائے یہاں تک کہ موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ نکالے۔ یہ ابتدائی اور عبوری حکم تھا؛ بعد میں سورۃ النور میں حدِ زنا کا مستقل حکم نازل ہوا اور سنت سے بھی اس کی تفصیلات ثابت ہوئیں، یوں گھروں میں قید رکھنے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ پانچویں منسوخ آیت سورۃ المجادلہ کی آیت 12 ہے، جس میں حکم دیا گیا تھا کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی (علیحدگی میں گفتگو) کرنا چاہو تو اس سے پہلے صدقہ دیا کرو۔ اس حکم کا مقصد منافقین کی کثرتِ ملاقات پر روک لگانا تھا؛ اگلی ہی آیت 13 میں یہ پابندی اٹھا لی گئی اور صدقے کی شرط منسوخ کر دی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس حکم پر عمل کا موقع خود انہیں میسر آیا۔ یہی وہ پانچ آیات ہیں جنہیں شاہ صاحب نے حقیقی منسوخ قرار دیا ہے۔

جدول: شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک پانچ حقیقی منسوخ آیات اور ان کے ناسخ

نمبر	منسوخ آیت (حوالہ)	منسوخ حکم	ناسخ
1	سورۃ البقرہ، آیت 180: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین	والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا فرض تھا	سورۃ النساء، آیات 11 تا 12 (آیاتِ میراث) اور حدیث: لاوصیۃ لوارث
2	سورۃ البقرہ، آیت 184: وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین	روزہ رکھنے کی طاقت رکھنے والے کو روزے کے بدلے فدیہ دینے کا اختیار تھا	سورۃ البقرہ، آیت 185: فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی — اصولِ تفسیر (1954) — امتحانی مشق نمبر 1 — صفحہ 17

سورۃ البقرہ، آیت 234 (عدت: چار ماہ دس دن)	بیوہ کی عدت اور اس کا نفقہ ایک سال تک مقرر تھا	سورۃ البقرہ، آیت 240: والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول	3
سورۃ النور، آیت 2 (حدِ زنا) اور سنت سے ثابت حکم	بدکاری کی مرتکب عورتوں کو گھروں میں قید رکھنے کا حکم تھا	سورۃ النساء، آیت 15: فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت	4
سورۃ المجادلہ، آیت 13	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی سے پہلے صدقہ دینا لازم تھا	سورۃ المجادلہ، آیت 12: اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجواکم صدقۃ	5

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ منسوخ آیات کی تعداد میں اختلاف نسخ کے مفہوم کی وسعت و تنگی کی وجہ سے پیدا ہوا؛ سلف کے وسیع مفہوم میں یہ تعداد سینکڑوں تک پہنچی، علامہ سیوطی نے اسے تقریباً اکیس تک محدود کیا، اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے پندرہ آیات کی توجیہ و تطبیق کر کے حقیقی منسوخ آیات کی تعداد صرف پانچ قرار دی: آیتِ وصیت، آیتِ فدیۂ صوم، آیتِ عدتِ حول، آیتِ حبس اور آیتِ صدقۂ نجویٰ۔ ذیل کے جدول میں یہ فہرست ناسخ آیات کے ساتھ مرتب شکل میں پیش کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے اس موقف نے بعد کے محققین کو بہت متاثر کیا اور آج کے اکثر محققین نسخ کے دائرے کو محدود رکھنے ہی کو قرآن کے اعزاز و حفاظت کے مناسب سمجھتے ہیں۔

سوال نمبر 5: شاہ ولی اللہ کے موقف کی روشنی میں مفسر کے لیے اسبابِ نزول کی اہمیت اور اس کے پہلوؤں کا تجزیہ (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ شاہ ولی اللہ کے موقف کی روشنی میں ایک مفسر کے لیے اسباب نزول کے موضوع کی اہمیت اور پہلوؤں کا تجزیہ کیجیے۔ (20)

تعارف

اسبابِ نزول اصولِ تفسیر کے ان مباحث میں سے ہے جن پر مفسرین نے ہمیشہ خاص توجہ دی ہے، کیونکہ کسی آیت کے پس منظر سے آگاہی اس کے مفہوم کو کھولنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ سببِ نزول سے مراد وہ واقعہ، سوال یا صورتِ حال ہے جس کے موقع پر یا جس کے جواب میں کوئی آیت یا آیات نازل ہوئی ہوں۔ تاہم اس موضوع میں ایک طرف افراط بھی ہوا کہ ہر آیت کے ساتھ کوئی نہ کوئی قصہ جوڑ دیا گیا، اور دوسری طرف بعض نے اس کی اہمیت ہی سے انکار کر دیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر میں اس موضوع پر نہایت متوازن اور بصیرت افروز موقف پیش کیا۔ اس [illegible] پہلے ان کا بنیادی موقف بیان کیا جائے گا، پھر اس کی روشنی میں مفسر کے لیے اسبابِ نزول کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

اسبابِ نزول کا مفہوم

علماء نے سببِ نزول کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ واقعہ یا سوال جو نزولِ وحی کے زمانے میں پیش آیا ہو اور اسی کے متعلق یا اسی کے دنوں میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو۔ مثلاً کسی صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شرعی سوال پوچھا اور اس کے جواب میں آیت اتری، یا کوئی خاص واقعہ پیش آیا جس پر تبصرے یا حکم کے طور پر آیت نازل ہوئی۔ امام واحدی نے اس موضوع پر مستقل کتاب اسباب النزول تصنیف کی اور فرمایا کہ کسی آیت کی تفسیر اس کے سببِ نزول جانے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس بحث کو تفصیل سے جمع کیا۔ اس علم کا ماخذ صحابہ کرام کی روایات ہیں، کیونکہ وہی نزول کے چشم دید گواہ تھے؛ اس لیے سببِ نزول کی روایت کو محدثین کے اصولوں پر پرکھنا بھی اس علم کا حصہ ہے، کیونکہ ضعیف یا موضوع روایت پر مبنی سبب آیت کے مفہوم کو بگاڑ بھی سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا بنیادی موقف: سببِ نزول کی حقیقت

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر کے باب اول میں اسبابِ نزول کی حقیقت پر ایک انقلابی نکتہ بیان فرمایا۔ انہوں نے لکھا کہ عام مفسرین نے احکام اور مخاصمے کی ہر آیت کے ساتھ کوئی نہ کوئی قصہ جوڑ دیا ہے اور یہ گمان کر لیا ہے کہ وہی قصہ اس آیت کا سببِ نزول ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے نزول کا اصل مقصد انسانی نفوس کی تہذیب،

باطل عقائد کا ازالہ اور فاسد اعمال کی اصلاح ہے۔ اس اعتبار سے آیاتِ مخاصمہ کے نزول کا حقیقی سبب مخاطبین کے دلوں میں باطل عقائد و شبہات کا موجود ہونا ہے؛ آیاتِ احکام کے نزول کا حقیقی سبب معاشرے میں ظلم اور فاسد اعمال کا شیوع ہے؛ اور آیاتِ تذکیر کے نزول کا سبب انسانوں کی غفلت ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں، اس کے ایام اور موت کے حوادث کو دیکھتے ہوئے بھی متنبہ نہیں ہوتے۔ رہے زائد واقعات اور جزئی قصے جن کے بیان میں مفسرین نے بڑی محنت کی ہے، تو ان کا تعلق صرف ان بعض آیات سے ہے جن میں عہدِ نبوی یا اس سے پہلے کے کسی واقعے کی طرف اشارہ و تعریض موجود ہو اور قاری اس اشارے کو دیکھ کر اس واقعے کی تفصیل جاننے کا منتظر ہو جائے؛ وہاں اس قصے کا بیان آیت کے فہم کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اس موقف کا مطلب یہ نہیں کہ شاہ صاحب اسبابِ نزول کے مخالف ہیں۔ اس کے برعکس الفوز الکبیر کے پانچویں باب، جو فتح الخبیر کے نام سے الگ بھی شائع ہوتا ہے، میں انہوں نے قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح کے ساتھ ان اسبابِ نزول کو جمع کر دیا ہے جن کا حافظے میں رکھنا سمجھ کے لیے ضروری ہے اور جن کے بغیر کتاب اللہ میں خوض کرنا ناجائز قرار دیا۔ گویا ان کی پوری بحث کا حاصل یہ اعتدال ہے کہ سببِ نزول نہ تو ہر آیت کے لیے تراشا جائے اور نہ وہاں اس سے غفلت برتی جائے جہاں وہ واقعی آیت کے مفہوم کی کنجی ہو۔ یہی اعتدال ان کے موقف کی اصل شناخت ہے جس کی روشنی میں مفسر کے لیے اس موضوع کی اہمیت کے پہلو سمجھے جا سکتے ہیں۔

مفسر کے لیے اسبابِ نزول کی اہمیت کے پہلو

پہلا پہلو آیت کے محل و موقع اور مخاطب کے تعین کا ہے۔ سببِ نزول جاننے سے مفسر کو معلوم ہوتا ہے کہ آیت کس سے خطاب کر رہی ہے، کس پس منظر میں کہہ رہی ہے اور اس کا فوری مدعا کیا ہے۔ بعض آیات کا ظاہری مفہوم سبب جانے بغیر مکمل طور پر نہیں کھلتا؛ مثلاً جن آیات میں کسی خاص گروہ یا شخص کی طرف اشارہ ہے، وہاں اشارے کا مرجع سبب ہی سے متعین ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو حکم کی علت و حکمت کی سمجھ کا ہے؛ سبب معلوم ہو تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ حکم کس خرابی کے علاج کے لیے آیا اور اس کا دائرۂ تطبیق کیا ہے، جس سے قیاس و اجتہاد کی راہ کھلتی ہے۔ تیسرا پہلو عام و خاص اور مطلق و مقید کی تعیین کا ہے؛ سببِ نزول کی روشنی میں مفسر فیصلہ کرتا ہے کہ حکم کا عموم برقرار رہے گا، کیونکہ مشہور اصول ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے سبب کی خصوصیت کا نہیں، یا آیت اپنے سبب کے ساتھ خاص رہے گی۔

چوتھا پہلو اجمال و ابہام کے ازالے کا ہے؛ بعض آیات میں ضمیر کا مرجع، اشارے کا مشار الیہ یا کسی مبہم واقعے کا حوالہ ہوتا ہے جو سببِ نزول کے بغیر حل نہیں ہوتا۔ پانچواں پہلو ناسخ و منسوخ کی پہچان کا ہے؛ جب دو حکموں کی تاریخ اور ترتیب معلوم ہو تو یہ فیصلہ ممکن ہوتا ہے کہ بعد والا حکم پہلے کو منسوخ کر رہا ہے یا دونوں الگ الگ صورتوں سے متعلق ہیں، اور یہ پہچان سببِ نزول اور شانِ نزول کی روایات سے حاصل ہوتی ہے۔ چھٹا پہلو غلط تطبیق سے حفاظت کا ہے؛ سبب سے واقف مفسر آیت کو اس کے تناظر سے کاٹ کر کسی غلط محل پر نہیں چسپاں کرتا، جبکہ سبب سے ناواقف شخص کثر آیات کو اس کے اصل مدعا سے ہٹا کر استعمال کر لیتا ہے، جس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ ساتواں پہلو تدریجِ تشریع کی معرفت کا ہے؛ اسبابِ نزول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے احکام کس حکمت اور تدریج سے نافذ کیے، جو داعی اور معلم کے لیے قیمتی رہنمائی ہے۔

احتیاط کا پہلو: شاہ ولی اللہ کی تنقید کا تجزیہ

شاہ ولی اللہ کی تنقید کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے تین اہم اسباق سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ سببِ نزول کی تلاش میں سیاق و سباق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے؛ اصل حاکم قرآن کا اپنا نظم، الفاظ اور سیاق ہے، سبب اس کا خادم ہے حاکم نہیں۔ اگر کوئی روایتِ سبب آیت کے سیاق سے ٹکرائے تو وہ قابلِ قبول نہیں رہتی۔ دوسرا یہ کہ اسبابِ نزول کی بہت سی روایات ضعیف، منقطع یا اسرائیلی قصوں پر مبنی ہیں، لہٰذا مفسر پر لازم ہے کہ وہ روایت کو اصولِ حدیث کی کسوٹی پر پرکھے اور ہر منقول قصے کو آنکھ بند کر کے سبب قرار نہ دے۔ تیسرا یہ کہ سبب کو آیت کے مفہوم تک محدود کر دینا بھی غلطی ہے؛ جب شارع نے لفظ عام اختیار کیا تو حکم بھی عام رہے گا، سبب محض نزول کا موقع ہے، حکم کی حد بندی نہیں۔ ان تینوں احتیاطوں کے ساتھ شاہ صاحب کا موقف ان مفسرین سے بھی مختلف ہے جو اسبابِ نزول کو سرے سے اہمیت نہیں دیتے، کیونکہ جہاں آیت میں تعریض و اشارہ موجود ہو، وہاں ان کے نزدیک سبب کا جاننا ضروری اور اس کے بغیر تفسیر ناقص بلکہ ممنوع ہے۔ یہ توازن طالب علم کو افراط و تفریط دونوں سے بچاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک اسبابِ نزول کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے نزول کا اصل سبب عقائدِ باطلہ کا ازالہ، اعمالِ فاسدہ کی اصلاح اور نفوس کی تہذیب ہے، اور جزئی واقعات اسباب صرف ان آیات سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کسی واقعے کی طرف تعریض و اشارہ موجود ہو۔ اسی بنیاد پر مفسر کے لیے اسبابِ نزول کی اہمیت کے

پہلو یہ ہیں کہ ان سے آیت کا محل و مخاطب متعین ہوتا ہے، حکم کی علت و حکمت سمجھ میں آتی ہے، عام و خاص کا فیصلہ ہوتا ہے، اجمال دور ہوتا ہے، ناسخ و منسوخ کی پہچان اور تدریجِ تشریع کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور آیت غلط تطبیق سے محفوظ رہتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ مفسر سبب کی روایت کو تنقیدی نظر سے پرکھے اور سیاقِ قرآن کو اصل حاکم مانے؛ یہی شاہ ولی اللہ کے موقف کا خلاصہ اور اسباب نزول کے موضوع کا درست مقام ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com